TPM Vol. 32, No. 2, 2025
ISSN: 1972-6325
https://www.tpmap.org/

Open Access

THE NARRATIVE OF CLASS CONFLICT AND EXPLOITATION IN MODERN URDU SHORT STORY

DR. UZMA NOREEN
LECTURER URDU DEPARTMENT G.C WOMEN UNIVERSITY SIALKOT.

DR. HUMERA ISHFAQ
DEPARTMENT OF URDU LANGUAGE AND LITERATURE INTERNATIONAL ISLAMIC UNIVERSITY ISLAMABAD.

ABSTRACT
Class conflict and exploitation have emerged as an important and influential theme in Urdu Short story. Especially under the influence of the progressive movement, Short story writers made the class inequality, economic exploitation and social injustice existing in society the center of their creations. According to them, many evils of society were the result of class division and the exploitative system, so they presented the life and problems of the deprived and downtrodden classes in their fiction in a realistic manner. Issues like the supremacy of the capitalist and feudal classes, exploitation of workers and peasants, poverty, unemployment and unfair distribution of resources became important themes of progressive fiction. Fiction writers showed how a privileged class, on the basis of its power and wealth, deprives the weaker classes of their rights and deprives them of basic human facilities. Short story writers like Krishna Chandra, Rajendra Singh Bedi, Saadat Hasan Manto and Ahmed Nadeem Qasmi presented class contradictions in a prominent manner in their fiction. Krishan Chandra's stories convey a deep sense of the deprivations of the peasants, laborers and the lower classes, while Bedi effectively highlighted the exploitation present in the daily lives of the middle and lower classes. Manto also exposed various aspects of social injustice and class division through his characters. Stories based on class struggle do not only identify problems but also express the desire for a better and fairer society. This is why the subject of class exploitation in Urdu stories is not just a literary expression but has also become an effective means of social consciousness, protest and social.

KEYWORDS: Urdu Short story, Class conflict, Exploitation, Krishna Chandra, Rajendra Singh Bedi, Saadat Hasan Manto, Ahmed Nadeem Qasmi, Poverty, Unemployment, Unfair distribution of Resources.

آزادی کے بعد ہندوستانی معاشرے میں سماجی اور معاشی مسائل میں نمایاں اضافہ ہوا۔ غربت، استحصال، بے روزگاری، جاگیردارانہ تسلط اور معاشی ناہمواری نے نچلے طبقے کی زندگی کو مزید دشوار بنا دیا۔ اگرچہ کسانوں اور مزدوروں نے اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے، لیکن ان کی معاشی حالت میں خاطر خواہ بہتری نہ آ سکی۔ جاگیرداری کے خاتمے کے بعد بے زمین مزدور روزگار سے محروم ہو گئے اور بہتر زندگی کی تلاش میں شہروں کا رخ کرنے پر مجبور ہوئے، جہاں انہیں مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

اردو افسانے میں اس طبقاتی کشمکش اور استحصال کو مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کرشن چندر کے افسانے "کچرا بابا" میں غربت اور محرومی سے تباہ حال ایک شخص کی داستان بیان کی گئی ہے۔ حالات کی سختیوں اور بھوک کے باعث وہ کچرے سے غذا تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن جب اسے کوڑے کے ڈھیر میں ایک لاوارث بچہ ملتا ہے تو اس کی زندگی میں امید کی ایک نئی کرن پیدا ہوتی ہے اور وہ دوبارہ باعزت زندگی گزارنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"لوگوں نے دیکھا کہ کچرا بابا آج کچرے کے شب کے قریب نہیں بیٹا ہے۔ بلکہ سڑک کے پارٹی تعمیر ہونے والی عمارت کے نیچے کھڑا ہو کر اینٹیں ڈھو رہا ہے اور اس عمارت کے قریب گل مہر کے ایک پیڑ کی چھاوں میں ایک پھولدار کپڑے میں لیٹا ہوا ایک تھا بچہ منہ میں دودھ کی چاشنی لئے مسکرا رہا ہے ۔"۔۱

درحقیقت افسانے میں "کچرا بابا" اس محروم اور استحصال زدہ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جس کی تشکیل میں سرمایہ دارانہ نظام کا اہم کردار ہے۔ ایک طرف دولت اور وسائل کی فراوانی ہے، جبکہ دوسری طرف غربت اور محرومی ایک انسان کو اس حد تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ "کچرا بابا" بن جاتا ہے۔ معاشرہ بھی اس کی انسانی شناخت اور وقار کو نظر انداز کرکے اسے اسی نام سے پکارنے لگتا ہے۔ کرشن چندر نے اس کردار کے ذریعے نہ صرف طبقاتی ناہمواری کو اجاگر کیا ہے بلکہ اس سماجی رویے پر بھی طنز کیا ہے جو انسان کو حالات کا شکار بنانے کے بعد اس کی تضحیک بھی کرتا ہے۔

"اور اس کا اعتقاد تھا کہ اس دنیا سے نیکی ختم ہو سکتی ہے ،وفا ختم ہو سکتی ہے رفاقت ختم ہو سکتی ہے، لیکن غلاظت اور گندگی کبھی ختم نہیں ہو سکتی ۔ ساری دنیا سے منہ موڑ کر اس نے جینے کا آخری طریقہ سیکھ لیاتھا۔"۔۲

افسانہ "مہالکشمی کا پل" بھی کرشن چندر کی ان تخلیقات میں شامل ہے جو طبقاتی استحصال اور سماجی ناانصافی کے خلاف احتجاجی شعور کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ افسانہ نہ صرف موجودہ سیاسی اور معاشی نظام پر تنقید کرتا ہے بلکہ حکمران طبقے اور سرکاری نمائندوں سے بھی سوال کرتا نظر آتا ہے۔ افسانے میں پل کے اطراف آباد محنت کش طبقے کی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس میں کرشن چندر نے سرمایہ دار اور غریب طبقے کے درمیان موجود وسیع خلیج کو نمایاں کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں وزیرِ اعلیٰ کی توجہ ان محروم لوگوں کی جانب مبذول کرائی ہے۔ افسانے میں "چھ ساڑیوں" کی علامت کے ذریعے چھ غریب خاندانوں کی غربت، محرومی اور بے بسی کو اجاگر کیا گیا ہے، جو انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ پورے افسانے میں مظلوم اور پسے ہوئے طبقے کی بے بسی، محرومی اور خاموش احتجاج نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

" میں دفتر میں سیٹھ کی گالیاں سنتا ہوں ۔ گھر پر بیوی کی گالیاں سنتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں شایدمیری بیوی کو ایک نئی ساڑھی کی ضرورت ہے ۔شاید اسے صرف ایک کی ساڑھی ہی نہیں ایک نئے چہرے ایک نئے گھر ایک نئے ماحول اور ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے مگر اب ان باتوں کو سوچنےسے کیا ہوتا ہے ۔ اب تو آزادی آگئی ہے اور ہمارے وزیر اعظم نے کہہ دیا ہے کہ اس نسل کو یعنی ہملوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی آرام نہیں مل سکتا۔ ۳

کرشن چندر کے افسانے " کا لو بھنگی"میں سماجی حقیقت نگاری ک واضح کی گئی ہے ۔اس سلسلے میں یہ اسی موضوع لکھے ہوئے افسانوں میں نمایاں حیثیت رکھتاہے۔ اس سلسلے میں گو پی چند نا رنگ کہتے ہیں کہ۔

""کالو بھنگی" ایک گرے پڑے رو کے پھیکے بے مزہ اور بے رنگ کردار کی کہانی ہے جس میں کرشن چندر نے مظلوم انسانیت کے حسن کو اجاگر کیا ہے ۔"۔۴

یہ افسانہ ایک ایسے شخص کی داستان ہے جو معاشرے کے پسماندہ اور محروم طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ "کالو بھنگی" ساری زندگی دوسروں کی خدمت کرتا رہتا ہے، مگر خود اس کی زندگی میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آتی۔ وہ بغیر کسی شکایت کے ایک مقررہ معمول کے مطابق زندگی گزارتا رہتا ہے۔ بظاہر اس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ نہیں جس پر کہانی لکھی جا سکے، لیکن اسی سادگی اور گمنامی میں اس کی المیہ زندگی پوشیدہ ہے۔ افسانہ نگار کے ذہن میں کالو بھنگی ایک سوال بن کر ابھرتا ہے کہ آخر اس جیسے بے شمار خاموش اور محروم انسانوں کی کہانی کب لکھی جائے گی۔ اسی احساس کے تحت وہ اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو قلم بند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

"کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس کے سارے آبا و اجداد بھنگی تھے۔ اسی طرح اس حالات میں۔ پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہ کیا تھا حد تو یہ ہے کہ دو کبھی اپنے گلوں سے باہر نہ گیا تھا وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ۔ بچپن ہی سے وہ اس طرح کرتاچلاآتا تھا ۔" ۔۵

کالو بھنگی کی زندگی میں بظاہر کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جو لوگوں کی توجہ اپنی جانب کھینچتا، سوائے اس کی انسان دوستی، معصومیت اور خدمت کے جذبے کے۔ اس نے بیس برس تک اسپتال میں نہایت دیانت داری سے مریضوں کی خدمت کی، لیکن اس کی وفات کے بعد اسپتال کی زندگی معمول کے مطابق چلتی رہی۔ کسی نے اس کے جانے کا خاص غم محسوس نہ کیا، بلکہ صرف دو جانور ہی ایسے تھے جو اس کی موت پر سوگوار دکھائی دیتے تھے۔ یہ منظر معاشرے کی بے حسی اور ایک خدمت گزار انسان کی گمنامی کو نمایاں کرتا ہےیہ اقتباس دیکھیں۔

"۔اوروہ جب مرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی ۔ روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال کھلا ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے تیار کئے مریضوں نے دو الی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا اور گھر آ کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا۔ ریڈیو سنا اور لحاف اوڑھ کر سو گئے صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے از راہ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی ۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپاونڈ ر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا اور وارڈ کے باہرکھڑے کھڑے بیکار چلاتی رہی" ۔ ۶

ان چند جملوں کے ذریعے کرشن چندر نے معاشرے کی بے حسی اور خود غرضی پر گہرا طنز کیا ہے۔ "کالو بھنگی" دراصل اس محروم طبقے کی علامت ہے جو مسلسل بے توجہی، احسان فراموشی اور بے مروتی کا شکار رہتا ہے۔ اس کی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ اس کی وفاداری اور خدمت کے باوجود معاشرہ اس کی قدر نہیں کرتا۔ اسی لیے افسانہ نگار آخر میں اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے اجتماعی شعور اور باہمی تعاون کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔وہ کہتاہے۔

" جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مددنہیں کریں گے یہ کام نہ ہوگا اور تو اسی طرح جھاڑولئے میرے ذہن کے درواز پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نولکھ سکوں گا جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت تعمیر نہ کر سکے گا جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھوئے اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کے پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھک جائے۔" ۔۷

کرشن چندر نے آزادی کے بعد پیدا ہونے والی طبقاتی کشمکش کو اپنے افسانوں میں مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ "پانچ روپیہ کی آزادی"، "سو روپیہ" اور "ایرانی پلاؤ" جیسے افسانوں میں انہوں نے دکھایا ہے کہ آزادی کے بعد غربت کے خاتمے کی امیدیں پوری نہ ہو سکیں اور نچلے طبقے کے حالات تقریباً جوں کے توں رہے۔ مجموعی طور پر کرشن چندر نے انسانی زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرتی حقائق کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور انسان دوستی کے نظریے کو نمایاں کیا۔ بقول سید ممتاز حسین۔

"کرشن چند ر کا مخاطب ہمیشہ انسان رہا ہے اور مظلوم انسان –" ۔۸

محنت کش طبقے کے مسائل کو خواجہ احمد عباس نے بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ترقی پسند دور کے افسانہ نگاروں نے سماجی حقیقت نگاری کے تحت نچلے طبقے کی زندگی اور مشکلات کو نمایاں کیا۔ "شکر اللہ" اور "سونے کی چار چوڑیاں" اس سلسلے کے اہم افسانے ہیں۔ افسانہ "شکر اللہ" ایک ایسے مزدور کی داستان ہے جو مسلسل استحصال کا شکار رہتا ہے اور ایک

حادثے میں اپنی ٹانگیں کھو دینے کے بعد بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن ان تمام مصائب کے باوجود وہ خدا کا شکر ادا کرتا رہتا ہے۔
"آپ یہ سن کر حیران ہوں گے سرکار کہ بھیک میں ڈیڑھ دو روپے روز سے زیادہ کما لیتا ہوں ۔ پھرجان کھپانے سے کیا حاصل۔" ۹۔

افسانہ "سونے کی چار چوڑیاں" میں خواجہ احمد عباس نے نچلے طبقے کے ایک نوجوان شنکر کی زندگی پیش کی ہے جس کی خواہش پاروتی سے شادی کے لیے سونے کی چار چوڑیاں حاصل کرنا ہے۔ اسی مقصد کے تحت وہ بمبئی جا کر غلط راستوں پر چل پڑتا ہے، مگر اس کے اندر کی انسانیت زندہ رہتی ہے۔ ایک حادثے کے دوران وہ ایک زخمی لڑکی کی مدد کرتا ہے اور بعد میں اس کی چوڑیاں واپس کر کے اپنی دیانت داری کا ثبوت دیتا ہے۔ اس واقعے کے بعد اس کی زندگی بدل جاتی ہے اور وہ محنت و مشقت کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ آخرکار پاروتی اسے ایک محنتی اور باکردار انسان کے روپ میں دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ افسانہ اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ حقیقی کامیابی اور خوشی دیانت، انسانیت اور محنت کے راستے پر چلنے میں ہے۔افسانے کاایک اقتباس یہ ہے۔
"پاروتی نے خاموشی سے سر ہلا کر کہا ۔ "نہیں"، اور پھر بولی ،نارے تو تو بلکل بدل گیا ہے ۔ اب ۔ تو (اور پھر آنکھیں جھکا کر دھیرے سے کہا) اچھا لگتا ہے"۔
"سچ؟" شنکر خوشی سے چلا یا ۔
"سچ "پاروتی نے نظر اٹھا کر کہا اور ان بڑی بڑی کالی آنکھوں میں اس وقت شنکر کو چار سونے کی چوڑیاں جگمگاتی ہوئی نظر آئیں ۔"۔۱۰

اوپندرناتھ اشک کے ہاں بھی استحصال ظلم وجبر کی تصویر نظرآتی ہے۔ ان کےافسانوں " کا کڑان کا تیلی"، " ابال"، " تین سوچوبیس" اور "بیداری کا خواب" وغیر ہ میں نچلے طبقے کے مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ اس حوالے سے عزیر احمدیوں گویاہیں۔
"مزدور طبقے کے مصائب کے متعلق انھوں نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں بھی بڑا درد اور خلوص ہے ،اور سستی رقت انگیزی بہت کم ہے ۔ ان میں طبقاتی کشمکش بھی نظر آتی ہے اور انفرادی نفسیات کا لطیف اورطنز آمیز مطالعہ بھی ۔ ایسے افسانوں میں "وہ میری منگیتر تھی"، تین سو چو بیس" اور کا کڑان کا تیلی" بہت دلچسپ ہیں ۔" کاکٹر ان کا تیلی "واقعہ نگاری کا شاہکار ہے ۔"۔۱۱

"کاکڑان کا تیلی" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں غربت، محرومی اور بے بسی کی دردناک تصویر پیش کی گئی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار مولوا اپنی تنگ دستی کے باعث نہ تو اپنے اہلِ خانہ کی ضروریات پوری کر پاتا

ہے اور نہ ہی انہیں زندگی کی بنیادی آسائشیں فراہم کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پاس اپنے قریبی رشتہ دار حسو کی شادی میں شرکت کے اخراجات بھی نہیں ہوتے، جس کی وجہ سے وہ اپنی بیوی اور بچوں کو واپس گھر بھیجنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں اشک نے غربت کے تلخ اثرات اور ایک غریب انسان کی مجبوریوں کو نہایت مؤثر انداز میں اجاگر کیا ہے۔

راجندرسنگھ بیدی کا افسانہ "گرم کوٹ" میں بیوی کی شوہر سے محبت کے ساتھ ہی وہ سماجی بد حالی اُبھر کر سامنے آئی ہے۔جہاں چھوٹی سی انسانی خواہش کو پورا کرنا بھی بے حد مشکل نظر آتا ہے ۔ عزیز احمد اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ۔
"نچلے متوسط طبقے کی زندگی کا نقشہ شاید ہی کسی نے ایسا اچھا کھینچا ہو اس کا کامیاب ترین نمونہ شاید" گرم کوٹ" ہے ۔ اس افسانے میں محبت اور معاشی حاجت مندی کی وہ تمام زنجیر یں وہ تمام کڑیاں نمایاں ہیں جو ایک غریب متوسط درجے کے خاندان کے افراد کو ایک دوسرے سے باندھے ہوئے ہیں ۔ ہر ایک دوسرے کے لئے قربانی چاہتا ہے۔ بجز بچوں کے جو ابھی اچھی طرح دنیا کے مصائب اور مسائل کو نہیں سمجھتے اور مٹائی اور کھلونوں کے لئے جائز طور پر ضد کرتے ہیں ... اس افسانے میں متوسط طبقے کی ہندوستانی بیوی کی بچی محبت اور ہمدردی کی تصویر ہے ایک خاندان کے چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں۔جذبات ،احساسات، ضروریات ،معاشی دشواریوں، محبت اور قربانی کی ایک دنیا آباد ہے" ۱۲

حیات اللہ انصاری کا افسانہ "موزوں کا کارخانہ" شہری زندگی کی مصروفیت، بے حسی اور مشینی طرزِ حیات کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانے میں بمبئی کی تیز رفتار زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔جہاں لوگوں کے پاس ایک دوسرے کے لیے وقت نہیں۔ ایک ادیب جب اس ہنگامہ خیز ماحول سے دور ایک ہوٹل میں قیام کرتا ہے تو ایک بچے کے مسلسل رونے سے پریشان ہو جاتا ہے، لیکن جب اسے اس رونے کی اصل وجہ معلوم ہوتی ہے تو اس کا نقطۂ نظر بدل جاتا ہے۔ لارنس کے کردار کے ذریعے انصاری نے جدید شہری زندگی کے نفسیاتی اثرات اور اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ انسان اپنی ذات تک محدود ہو کر دوسروں کے دکھ درد سے بے نیاز ہوتا جا رہا ہے۔یہ اقتباس دیکھیں۔
"بمبئی کی زندگی کچھ ایسی ہے کہ وہاں ایک فلیٹ کے رہنے والوں کو پڑوس سے کوئی غرض نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے پڑوس میں یا تو بچے تھے ہی نہیں، یا تھے تو ان کو پڑوس کے بچوں سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس طرح ننھالا رنس اپنی زندگی کی قید تنہائی میں کاٹ رہا تھا ۔ "۔۱۳

لارنس کی افسردہ اور غیر معمولی کیفیت کے پس منظر میں دراصل وہ معاشی تنگی اور خاندانی مسائل ہیں جنھوں نے اس کی طلاق یافتہ ماں کو مسلسل محنت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ حیات اللہ انصاری نے لارنس کے کردار کے ذریعے نہ صرف ایک معصوم بچے کی نفسیاتی الجھنوں کو اجاگر کیا ہے بلکہ جدید معاشرے کے مستقبل پر بھی ایک معنی خیز سوال اٹھایا ہے۔ ان کے نزدیک معاشی بدحالی اور خاندانی انتشار نئی نسل کی شخصیت اور ذہنی نشوونما پر گہرے منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ عظیم الشان صدیقی کہتے ہیں۔
"حیات اللہ انصاری نے بچوں کی نفسیات ان کی محرومیوں اور سماج کے مستقبل کو موضوع بنایا ہے۔ اس سماج کا مستقبل کیا ہوگا جس کے نونبال اپنی عمر کی ابتدائی منزلوں میں محبت، رفاقت، تحفظ اور کفالت سے محروم رہیں گے اور جوان ہونے پر ان کی محرومیاں جب انتقامی شکل اختیار کریں گی تو معاشرہ سماجی او را خلاقی اقدار اور سیاسی نظام کدھر جائے گا ۔ ۱۴

افسانہ "موزوں کا کارخانہ" میں حیات اللہ انصاری نے لارنس کے کردار کے ذریعے والدین کی شفقت سے محروم بچے کی نفسیاتی اور سماجی کیفیت کو پیش کیا ہے، جبکہ "بھیک" میں یتیم اور لاوارث بچوں کی محرومیوں اور ان کے غیر محفوظ مستقبل کی تصویر کشی کی ہے۔ اسی طرح "بہت ہی باعزت" میں اعلیٰ متوسط طبقے کے سرکاری افسروں کی بدعنوانیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد پیدا ہونے والی طبقاتی کشمکش اور معاشرتی تبدیلیوں نے گھریلو زندگی کو بھی متاثر کیا، جس کی مؤثر عکاسی افسانہ "آخری کوشش" میں ملتی ہے۔ سماجی حقیقت نگاری کے اعتبار سے اس افسانے کو نمایاں مقام حاصل ہے، اور ناقدین اسے اکثر پریم چند کے شاہکار "کفن" کی ترقی یافتہ صورت قرار دیتے ہیں۔ بقول خلیل الرحمن اعظمی کے مطابق:

"جس افسانے نے حیات اللہ کو قد راصل کا افسانہ نگار بنایا وہ "آخری کوشش "ہے - "آخری کوشش "اردو کے چند بہترین افسانوں میں سے ہے۔ اس میں گہرائی معنویت اور انسان کے بنیادی مسائل کا عرفان ہے۔ یہ افسانہ ایک طرح سے پریم چند کے آخری افسانہ کفن کی ترقی یافتہ شکل ہے اور اس میں بھی وہ ٹھہراؤ اور شعورہے جو پریم چند کے افسانے کا خاصہ ہے ۔۱۵

اس افسانے کی ادبی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض ناقدین نے اسے کئی حوالوں سے "کفن" سے بھی زیادہ مؤثر قرار دیا ہے۔ اگر افسانے کے موضوع، کردار نگاری، فنی ساخت اور سماجی شعور کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ رائے کسی حد تک قابلِ قبول محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر محمدصادق کےبقول۔

""آخری کوشش" میں حیات اللہ انصاری کا فن حقیقت نگاری کی ان بلندیوں پر پانچ گیا ہے جہاں تک پریم چند کی رسائی بھی نہیں ہو سکی ہے ۔ کفن اردو کا مکمل اور شاہکا را فسانہ کہلانے کے باوجود حقیقت نگاری کے معاملے میں "آخری کوشش" سے بہت پیچھے ہے ۔۱۶

یہ افسانہ زندگی کی ایسی تلخ حقیقتوں کو سامنے لاتا ہے جن کا تصور بھی انسان کے لیے تکلیف دہ ہے۔ اس میں ایک ایسے محروم اور استحصال زدہ طبقے کی داستان بیان کی گئی ہے جو نہ دیہی زندگی کی آسودگی سے بہرہ مند ہے اور نہ ہی شہری زندگی کی سختیوں سے نجات پا سکا ہے۔ غربت اور مجبوری انہیں اس حد تک لے آتی ہے کہ وہ انسانی اقدار اور ماں کے احترام کو بھی فراموش کر کے اپنی بوڑھی ماں کو بھیک مانگنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ افسانے کا آغاز ایک مسجد کے باہر کے منظر سے ہوتا ہے، جہاں یہ المناک حقیقت نہایت مؤثر انداز میں سامنے آتی ہے۔

"دونوں ڈولی لے کر مسجد کے سامنے آئے ۔ خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ کٹی انگلیاں اور بیٹھی ناک والے کو بھی، منمنا کر ڈراونی آواز میں بولنے والی آتش کی بوڑھیاں، چندے چیڑے بچے جن کے ہاتھ پاوں سوکھے اور پیٹ بڑھے ہوئے تھے، جو نہ جانے کیوں مسلسل ریں ریں کر رہے تھے ،پھیکے، بے حیا دیدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پر جوڑوں کا جنگل اور بدن پر میل کی کہگل، چیتھڑے، ٹھیکرے، میل، آخور، بلغم، ناک ،پیپ ،مکھیاں، جراثیم، فریب ،جھوٹ اور ان سب کو ڈھانک دینے والی، لوریاں دے دے کر ،تھپک تھپک کر سلا دینے والی مہا پاپن بے حسی۔"۔۱۷

یہ اقتباس سماجی حقیقت نگاری کے اس تلخ پہلو کو نمایاں کرتا ہے جہاں معاشی بدحالی انسان کو ایسے فیصلے کرنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ رشتے، محبت اور خاندانی اقدار بھی بے معنی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں بنیادی ضروریات ہی سب سے بڑی حقیقت بن جاتی ہیں اور ان کی تکمیل کے لیے انسان ہر حد پار کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ افسانے میں بھی معاشی تنگی سے مجبور دونوں بیٹے بالآخر اپنی بوڑھی ماں کو بھیک مانگنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، جو غربت اور استحصال کی انتہائی المناک تصویر پیش کرتا ہے۔

اسی طرح غلام عباس کا افسانہ "چکر" متوسط اور نچلے طبقے کے اس فرد کی داستان ہے جو جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے استحصالی ڈھانچے میں پس کر رہ جاتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار چہلارام ایک معمولی کلرک ہے، جو دن رات محنت کرکے اپنے مالک سیٹھ چھٹامل کی دولت میں اضافہ کرتا ہے، مگر خود محرومی، تھکن اور بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور رہتا ہے۔ غلام عباس نے چہلارام کی شخصیت اور اس کے حالات کی ایسی مؤثر تصویر کشی کی ہے کہ قاری اس کے معاشی استحصال اور بے جان زندگی کی مکمل کیفیت کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور صورت سے عجیب ہونق پن برس رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں، پلکیں اور بھویں گرد سے اٹی ہوئی تھیں ۔ دن بھرلُو اور دھوپ کے تھپیڑے کھا کھا کر اس کے چہرے کی رنگت ایسی سیاہی مائل سرخ ہو گئی تھی جیسے کسی مردے کی جس کے چیرے کے پاس لکڑیوں کی آنچ پہلے پہل پہنچنی شروع ہوئی ہو ۔" ۔۱۸

ہریجنوں سے متعلق مسائل پر بھی ہمارے کئی افسانہ نگاروں نے قلم اٹھایا ہے ۔ پریم چند نے "نجات" لکھ کر دبے کچلے اور استحصال کی مار جھیل رہے اس طبقے کی طرف سب کو مرتکز کرنے کی جو کوشش کی تھی ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اُس راہ میں مزیدقدم بڑھائے ۔ حالانکہ اس طرح کے مسائل پر زیادہ نہیں لکھا گیا لیکن پھر بھی ہمارے افسانہ نگاروں کے یہاں یہ مسائل اکثر اٹھتے نظر آتے ہیں ۔ خواجہ احمد عباس نے "ٹیری لین کے پتلون اورتین بھنگی" ، علی عباس حسینی کا "لاٹھی پو جا "اور عصمت چتائی نے "دو ہاتھ" جیسے افسانے لکھ کر ادب میں اس موضوع کو زیر بحث لانے کی کوشش کی۔خواجہ احمد عباس کا افسانہ"ٹیری لین کے پتلون اورتین بھنگی" میں ایک نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے ملکو نامی ایک بھنگی کے جذبات اور اپنے بھنگی ہونے کے سبب کی جانے والی ذات پات کی تفریک سے متاثر ہو کر علم حاصل کرنے اور اپنی پہچان تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ایک شخص کی کہانی بیان کی ہے۔ اس حوالے سے یہ اقتباس پیش کیاجاتاہے۔

"اسٹیشن پر جانے کی دکان پر کھڑے ہو کر اس نے سامنے لگے قد آدم آئینے میں اپنے آپ کو غور سے دیکھا ۔ بالکل صاحب لگتا ہوں ۔ آسمانی رنگ کے دس روپے کی شرٹ ۔ اسی روپیہ کی ٹیری لین کی پتلون۔ مجھ میں کیا برائی نظر آئی "۔۱۹

علی عباس حسینی نے اپنے افسانہ "لاٹھی پوجا" میں آزادی کے بعد بدلتے ہوئے سماجی حالات اور ہریجن طبقے کی بہتر ہوتی ہوئی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ افسانے میں دکھایا گیا ہے کہ زمین پر حقِ ملکیت حاصل ہونے کے بعد ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ حکومتی واجبات بھی خوش دلی سے ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح عصمت چغتائی کے افسانہ "دو ہاتھ" میں نچلے طبقے کی زندگی کی ایک ایسی حقیقت پیش کی گئی ہے جو سماجی رسم و رواج اور عزت و ذلت کے روایتی تصورات سے بالاتر ہے۔ گوری کا اپنے شوہر رام اوتار کی غیر موجودگی میں بچے کو جنم دینا اور رام اوتار کا اس بچے کو قبول کر لینا اس بات کی علامت ہے

کہ اس طبقے کے لیے معاشی بقا اور عملی زندگی کے مسائل سماجی بدنامی سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ رام اوتار کے جذبات کے بارے میں فضیل جعفری لکھتے ہیں۔

"یہ وہ موڑ ہے کہ جہاں عصمت پوری شدت کے ساتھ افسانوی معنی کی ترسیل کر دیتی ہیں۔ رام اوتا رہے جس نہیں ہے لیکن غربت اور غیر محفوظ مستقبل اسے بے غیرت بنانے اور حالات سے سمجھوتاکرنے پر مجبور کر دیتے ہیں ۔" ۱۹

اس مجموعی بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو افسانے کا ایک اہم رویہ سیاسی اور معاشی استحصال کے خلاف احتجاج ہے۔ آزادی کے بعد بہتر زندگی اور روشن مستقبل کی امیدیں پوری نہ ہو سکیں، جس کے نتیجے میں فرد تنہائی، عدم تحفظ، بے سمتی اور معاشی مشکلات کا شکار ہوا۔ دیہی زندگی سے شہری زندگی کی طرف ہجرت، صنعتی ماحول اور بڑھتے ہوئے معاشی دباؤ نے انسانی رشتوں کو بھی متاثر کیا۔ ان بدلتے ہوئے سماجی حالات اور ان کے اثرات کی مؤثر عکاسی نئی نسل کے افسانہ نگاروں نے اپنے فن میں نمایاں انداز سے کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔کرشن چندر،مجموعہ کرشن چندر،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۲۰۰۰ء،ص ۱۲۳

۲۔ایضاً،ص ۱۱۸۔۱۱۹

۳۔اطہرپرویز،اردوکےتیرہ افسانے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ، دہلی،۲۰۱۰ء،ص۳۶۔۳۷

۴۔ایضاً،ص۷

۵۔ایضاً،۱۲۶۔۱۲۷

۶۔ایضاً،ص ۱۳۲

۷۔ایضاً،ص ۱۴۱

۸۔ممتازحسین،نئے تنقیدی گوشے،اترپردیش اردواکادمی لکھنو،ص ۲۳۱

۹۔رام لعل، خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ، دہلی،۲۰۱۰ء،ص۲۲۸

۱۰۔ایضاً،ص ۱۲۹

۱۱۔عزیزاحمد،ترقی پسندادب، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ، دہلی،۲۰۰۰ء،ص۱۰۶

۱۲۔ایضاً،ص ۱۱۷۔۱۱۸

۱۳۔ حیات اللہ انصاری،شکستہ گنکورے،الف اکادمی، دہلی،۱۹۹۰ء،ص۸۲۔۸۳

۱۴۔عظیم الشان صدیقی،اردوافسانہ،فکری وفنی مطالعہ،۲۰۰۱ء۔ص۱۷۹

۱۵۔خلیل الرحمان اعظمی،اردومیں ترقی پسندادبی تحریک،اترپردیش اردواکادمی لکھنو، ۱۹۸۹ء،ص ۲۱۴

۱۶۔ڈاکٹرمحمدصادق،ترقی پسندافسانے کے پچاس سال،مشمولہ ترقی پسندادب،ص ۳۶۲

۱۷۔اطہرپرویز،اردوکےتیرہ افسانے،ص۲۰۲

۱۸۔غلام عباس،آنندی،فکشن ہاوس لاہور،۱۹۹۹ء،ص۱۶۴

۱۹۔خواجہ احمدعباس،نئی دھرتی نئے انسان، الف اکادمی، دہلی،۱۹۹۷ء،ص۱۶۲

۲۰۔ڈاکٹرگوپی چندنارنگ،اردوافسانہ:روایت اورمسائل،ہندوستانی اکیڈمی دہلی،۲۰۰۵ء،ص ۴۳۲۔۴۳۳